اُستاذُ العلماء ـــــ مولانا محمد چراغ کی یاد میں

جناب پروفیسر محمد اسلم اعوان

برصغیر پاکستان و ہند میں، فکرِ اسلامی اور احیائے اسلام کی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلامیانِ ہند کے بارہ سو سالہ عہدِ اقتدار (۷۱۲ — ۱۸۵۷ء) میں چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر نظامِ حکومت اور معاشرہ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے کسی سنجیدہ اور مستقل سلسلۂ مساعی کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے — اور آخر کار وہ وقت بھی آیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اسلامیانِ پاکستان و ہند مایوسی کی انتہاہ گہرائیوں میں گرتے گئے حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال جیسا رجائیت پسند اور نابغۂ روزگار شخص بھی اِس حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدائے تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال بڑے خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دکانیں ہیں، مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ کئی صدیوں سے علماء اور صوفیا میں طاقت کے لیے جنگ رہی، جس میں آخر کار صوفیا غالب آئے یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں۔ وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں، ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علما کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیا کی کوشش کی مگر صوفیاء کی کثرت اور

صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان، جو ذوقِ خدا داد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے۔ جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں.....۔"

مکتوب بنام اکبر الہ آبادی مرقومہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء

(بحوالہ اقبال نامہ جلد ۲ ص ۴۷ تا ۴۹)

ڈاکٹر اقبال ذوقِ خداداد اور قوتِ عمل رکھنے والے جس نوجوان کی تلاش میں تھے، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے، برصغیر پاکستان و ہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جانِ پُرسوز رکھنے والا وہ نوجوان سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ — ۱۹۷۹ء) کی صورت میں سامنے آیا۔ جس کی تفصیل مشہور بزرگ صحافی اور برصغیر میں برپا ہونے والی تمام تحریکوں کے عینی شاہد میاں محمد شفیع (المعروف م۔ش) کی نگارشات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق میاں صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"میں سو فی صدی ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ علامہ نے مولانا مودودیؒ کو ایک خط کے ذریعے حیدرآباد (دکن) کے بجائے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت دی تھی بلکہ وہ خط انھوں نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا۔"

(بحوالہ لاہور کی ڈائری ہفت روزہ "اقدام" لاہور
۹ جون ۱۹۶۳ء)

مولانا مودودیؒ کی ذات اور خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ برسبیل تذکرہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جماعتِ اسلامی کے قیام کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام یک زبان ہو کر اس تحریک کے دست و بازو بن جاتے لیکن شومئی قسمت سے علماء کی اکثریت نہ صرف جماعت سے گریزاں رہی بلکہ باقاعدہ محاذ آرائی

کے ذریعے اپنی قوتوں کے بے پایاں ضیاع کا سبب بنی - چنانچہ متحدہ کانگریس اور اشتراکیت کے حامی اس میں نمایاں رہے ـــ اور اس کا سب سے بڑا سبب وہ حزبی تعصب، گروہی پاسداری اور دیگر وہ عوامل تھے، جن کا ذکر ڈاکٹر اقبال رح نے اپنے مکتوب میں کیا تھا۔

اِن حالات میں طبقۂ علماء میں سے ایک ایسی شخصیت سامنے آئی جس نے مسلک وغیرہ کی طرف داری سے ہٹ کر، اور علانیہ طور پر شرحِ صدر کے ساتھ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق دین کی خدمت کے لیے جماعتِ اسلامی کا ساتھ دیا۔ یہ شخصیت انور شاہ کاشمیری کے شاگردِ خاص مولانا محمد چراغ کی تھی، جو ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ بمطابق ۲۱ اپریل ۱۹۸۹ء کو پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، افغانستان، ماریشس اور پوری دُنیا میں پھیلے ہوئے اپنے ہزاروں شاگردوں اور نیاز مندوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

ترجمہ: "نفسِ مطمئن! چل اپنے رب کی طرف، اِس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں"

مولانا محمد چراغ ۱۴ جمادی الاوّل ۱۳۱۴ھ (بمطابق ۱۸۹۴ء) کو موضع دھکڑہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام حافظ کرم دین تھا۔ ابتدائی عربی تعلیم نزدیکی گاؤں موضع گنجہ میں مولانا سلطان محمود صاحب کے مدرسے میں حاصل کی، جو دیوبند کے سابق فاضل اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) کے شاگردوں میں سے

تھے۔ ان کے بعد موضع آنی ضلع گجرات میں مولانا ولی اللہ[1] سے کسبِ فیض کیا۔ مولانا ولی اللہ کا تعلق کسانوں کے ایک خوشحال خاندان سے تھا۔ چنانچہ وہ اپنے تمام طلبا اور شاگردوں کو اپنے گھر سے کھانا اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرتے اور ان کے مدرسے کے طلبہ کو عام اجازت تھی کہ ان کی وسیع و عریض زمینوں سے گنے توڑیں اور دیگر موسمی سبزیات اور فواکہات سے جب چاہیں لطف اندوز ہوں ــــ اور مولانا کے علمی تبحر کا یہ عالم تھا کہ متداول کتابوں میں جس کتاب کے مشکل ہونے کے سبب دیگر مدرسوں کے ارباب، عذر کا اظہار کرتے، وہ کتاب موضع آنی میں ــــ مولانا ولی اللہ (وفات ۱۹۷۳ء) کے مدرسے میں پڑھائی جاتی ــــ موضع آنی کے مہتمم مدرسہ اپنے استاذ گرامی کے حکم کے مطابق علمی بساط بچھانے کے لیے اس مقام کو چھوڑ کر موضع دندہ شاہ بلاول ضلع کیمل پور گئے تو کم سن شاگرد محمد چراغ بھی اس عالمی مرتبت استاد کے ہمراہ تھے مختلف مقامات پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد سراج صاحب کے پاس چار سالہ قیام کے دوران مدرسہ جامعہ نعمانیہ اچھرہ لاہور میں حصولِ علم کے ساتھ ساتھ خطاطی اور خوش نویسی سیکھی ــــ انھی دنوں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور دیوبند کی علمی بہاروں کے چرچے سُن کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور پہنچے اور مولانا محمد الیاس صاحب بانیِ تبلیغی جماعت سے فقہ کی مشہور کتاب "کنز الدقائق" پڑھی اور ان کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوئے تکمیل کے لیے دیوبند میں داخل ہوئے اور مولانا انور شاہ کاشمیری سے فیضِ علمی حاصل کیا۔ چنانچہ شاہ صاحب موصوف سے ترمذی شریف، میاں اصغر حسین سے ابوداؤد، مفتی عزیز الرحمٰن سے طحاوی اور مولانا اعزاز علی صاحب سے ادبِ عربی کی کتب حماسہ، متنبی اور مقامات وغیرہ پڑھیں۔ لیکن خصوصی کسبِ فیض علامہ انور شاہ کاشمیریؒ سے

[1] مولانا ولی اللہ صاحب کی صحیح وفات ۱۹۷۳ء ہے جو ابتداءً میں سہواً نہیں لکھ سکا ہوں۔ چنانچہ مضمون کی اشاعت کی صورت میں مولانا کے اوّلین تذکرہ کے ساتھ اس کی اشاعت ہو جائے۔

ہی کیا - اور اُن کے خاص الخاص شاگردوں کی صف میں جگہ پانے کا اندازہ اس ایک درج ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت انور شاہؒ ترمذی شریف پڑھاتے وقت اپنے تلامذہ کے سامنے اس کی شرح اُردو زبان میں کرتے - لیکن متعلم محمد چراغ کے عربی زبان و ادب پر ماہرانہ عبور اور زود نویسی و خوش نویسی کا یہ عالم تھا کہ آپ اُستاد کی اُردو تقریر و شرح کو سن کر اُسی وقت اپنے طور پر عربی زبان میں ترجمہ کر کے اپنی نوٹ بک پر منتقل کرتے جاتے - اور ہو بہو حضرت شاہ صاحب کی تقریر انتہائی نفاست اور خوش نویسی سے مکمل محفوظ کر لی - چنانچہ دورۂ حدیث کے اختتام پر جب اُستاد نے طلبا کے نوٹس (NOTES) کی کاپیاں ملاحظہ کیں تو تمام طلبا نے آپ کی تقریر کو اُردو زبان میں لکھا ہوا تھا، لیکن مولانا محمد چراغ کی تحریر کردہ شرح و تقریر ہو بہو نفاست سے لکھی ہوئی مکمل عربی زبان دیکھی تو ایسے لائق و فائق شاگرد پر رشک کرتے ہوئے فرمایا — " کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میری شرح و تقریر کو اس مکمل انداز میں لکھنے والا کوئی ایسا طالب علم بھی موجود ہے تو میں اپنی تقریر کو اور بھی طویل کر دیتا — " چنانچہ یہ شرح " العرف الشذی " کے نام سے معروف ہوئی -

دورۂ حدیث کے اختتام کے قریب ایک عراقی شیخ عبدالغفور موصلی نے آپ سے بخاری و ترمذی کی کاپی دیکھی تو بخاری کی کاپی نقل کرنے کی درخواست کی - آپ نے ازراہِ دلداری تقریر نقل کر دی - آپ دورۂ حدیث کے بعد گھر واپس آئے - سالانہ تعطیلات میں اتفاقاً شیخ موصلی سے حضرت شاہ صاحب نے تقریر بخاری دیکھی تو انہوں نے کہا کہ یہ شیخ سراج فنجابی (شیخ چراغ پنجابی) سے نقل کروائی ہے - اس پر حضرت شاہ صاحب متاثر ہوئے اور فرمایا " اچھا میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس زمانے میں بھی کچھ لوگ ذی سواد ہوتے ہیں " - انہی دنوں مولانا مظفر جہلمی کی وساطت سے شاہ صاحب نے آپ کو گاؤں سے دیوبند واپس بلوایا اور ترمذی کی پوری تقریر نوٹ کروائی - آپ نے دو نسخے تحریر کیے ایک حضرت شاہ صاحب کے لیے اور دوسرا اپنے لیے - حضرت شاہ صاحب نے اپنے نسخے میں کچھ حک و اضافہ فرمایا، جو بعد میں دوسرے ایڈیشن میں شاملِ اشاعت کر لیا گیا -

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے علوم و معارف کے بے پایاں ہونے کا اندازہ اس حقیقت سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک زمانے میں ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ قادیانیت کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اقبالؒ جیسے نابغۂ روزگار شخص کو قادیانیت کی گمراہی کی دلدل سے نکالنے والی ذات مولانا انور شاہ کاشمیری کی تھی۔ جنہوں نے اپنے بے پایاں علم سے اقبالؒ کو ضائع ہونے سے بچا لیا ۔۔۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک اُستاد کا تذکرہ نہ کیا جائے شاگرد کے رجحانِ طبع کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔۔۔ یہاں مزید گنجائش تو نہیں البتہ انور شاہ کاشمیری کی انصاف پسندی اور مسلکِ اعتدال کا اندازہ لگانے کے لیے ایک واقعہ ہی کافی ہے جو اُن کے ایک شاگرد کی زبانی سنیے کہ ” قادیان میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر پر مشتمل ہمارا ایک جلسہ ہر سال ہوا کرتا تھا اور مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جلسہ میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اِس جلسہ میں تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں داخل ہوا کہ حضرت سر پکڑے مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں ٹھیک ہی ہے۔ میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔ فرمایا میں تمہیں صحیح کہتا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔ میں نے عرض کیا، حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح کو ثابت کر دیں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کاوشوں کا، تقریروں کا، علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، اُن کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے، وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا

وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔ اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء، جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب متحمل الخطا یا درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے ثابت کریں اور دوسرے مسلک کو خطا متحمل الصواب (غلط مسلک جس میں حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔ ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا — اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بھی تمام تر تحقیقات و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح ہے — یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے، قبر میں منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا آمین بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور قبر میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب کے الفاظ یہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نہ شافعیؒ کو رسوا کرے گا، نہ ابو حنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو، نہ احمد بن حنبل کو جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے جنہوں نے ہدایت کا نور چار سو پھیلایا۔ جن کی زندگیاں ہدایت کا نور پھیلانے میں گذریں — اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا۔ یا اس کے برعکس نہیں ہوگا۔ تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں، نہ محشر میں۔ اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی۔ مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی۔ آج یہ دعوت نہیں دی جا رہی ہے۔

یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں۔ اور منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے رہنا چاہیے تھا، وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آرہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے۔ حرام و حلال کا امتیاز اُٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں اِن فروعی بحثوں میں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی ..... الخ

چنانچہ بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اِس شہرہ آفاق اُستاد کی انصاف طبعی، معتدل مسلک اور متوازن کو، حضرت کے ہزاروں شاگردوں میں سے اگر کسی نے صحیح معنوں میں حرزِ جاں بنایا تو وہ مولانا محمد چراغ ہی تھے، جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

دیوبند سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے اُستاد گرامی کے حکم پر میرٹھ تشریف لے گئے۔ جہاں کے مدرسہ کے اربابِ حل و عقد کی جانب سے ایک لائق استاد کی طلب پر حضرت شاہ صاحب نے آپ کا انتخاب کیا۔ وہاں آپ نے ایک سال تدریس کا کام کیا۔ میرٹھ سے واپسی پر لاہور جامعہ فتحیہ اچھرہ میں کچھ عرصہ کام کیا۔

سید جماعت علی شاہؒ (۱۸۴۵ — ۱۹۵۱ء) علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ نے باوجود اختلافِ مسلک کے آپ کے تبحرِ علمی سے متاثر ہو کر اپنے صاحبزادے پیر محمد حسین کی تعلیم کے لیے آپ کو انتہائی ادب و احترام سے علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ میں مدعو کیا۔ چنانچہ آپ نے سید محمد حسین ابن سید جماعت علی شاہ کو بھی تعلیمِ دین سے بہرہ یاب فرمایا۔

بعد ازاں مدرسہ انوار العلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک تدریسِ علم کا کام کیا۔ یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو مسجد ارائیاں بیرون کھیالی دروازہ گوجرانوالہ میں مدرسہ جامعہ عربیہ کی بنیاد رکھی — ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۷ء تک اسی مدرسہ کو رونق بخشی۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں گوجرانوالہ سے لاہور جانے والی سڑک جی۔ٹی روڈ کی مغربی سمت پر نہر اپر چناب کے تقریباً ایک ایکڑ شمال میں انتہائی پُرفضا مقام پر

ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین پر جامعہ عربیہ کو منتقل کیا۔ جہاں آپ تا دمِ آخر تشنگانِ علم کو فیض یاب فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ کے ہزاروں شاگرد، علمائے کرام کی مسند پر فائز ہو کر پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، ماریشس اور دنیا بھر میں دینِ متین کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں۔

مولانا محمد چراغ مدرسہ و منبر و محراب کی دنیا میں رہ کر بھی ملی تقاضوں سے غافل نہ رہے۔ جب یہ سمجھا کہ انگریز مسلمانوں کا دشمن ہے تو اس کے خلاف آزادی کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا ـــــ مہاراجہ کشمیر کے خلاف تحریک میں اکابرین کی گرفتاری کے بعد تیسرے یا چوتھے قائم مقام سربراہ مولانا چراغ بنے۔

تحریکِ اسلامی سے اپنا تعارف کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا خود فرماتے ہیں کہ:

"قیامِ پاکستان سے پہلے قادیانیوں کے ایک مقدمے کے سلسلے میں ڈیرہ غازی خاں گیا ہوا تھا۔ جہاں سردار محمد خاں پتافی کے ہاں میں نے "ترجمان القرآن" کا ایک پرچہ دیکھا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور میں گورنمنٹ کالج لاہور کے فاضل پروفیسر مولانا کریم بخش کی معیت میں اسلامیہ پارک لاہور پہنچا اور ان سے بالمشافہ گفتگو کا پہلا موقع ملا۔ یہ بات اغلباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء کی ہے اسی وقت سے میں ترجمان القرآن کا مستقل خریدار بن گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دہلی میں جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اس میں شرکت کرنی تھی۔ مولانا محترم نے مجھے اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" پڑھنے کو دی اور مشورہ دیا کہ کانفرنس میں شامل ہونے سے پہلے اس کا مطالعہ کروں۔ لیکن جونہی میں نے اسے پڑھنے کے لیے کھولا۔ بالکل ابتدا ہی میں کانگریس کے لیے "بچۂ فرعون" کی ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ چونکہ اس وقت میں کانگرسی تھا، اس لیے ان لفظوں سے دل کو ٹھیس پہنچی اور میں نے اس کتاب کا مطالعہ بند کر دیا۔ البتہ دہلی سے واپسی پر راستے میں، میں نے اس کتاب کا مطالعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا تو آنکھیں کھل گئیں، مضبوط دلائل کی بے پناہ کاٹ نے باقی آرا کو صاف کر دیا۔ اور میں مولانا کے خیالات سے متفق اور مطمئن ہو گیا۔ (باقی بر صفحہ ۳۴)